نظم

نظم کے معنی ''انتظام، ترتیب یا آرائش'' کے ہیں۔ عام اور وسیع مفہوم میں یہ لفظ نثر کے مدِّ مقابل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس سے مراد پوری شاعری ہوتی ہے۔ اس میں وہ تمام اصناف اور اسالیب شامل ہوتے ہیں جو ہیئت کے اعتبار سے نثر نہیں ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں غزل کے علاوہ تمام اصناف میں کی جانے والی شاعری کو ''نظم'' کہتے ہیں۔ لیکن جب ہم نظم کو بطور منفرد شعری صنف کے دیکھتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد پوری نظم کا تانا بانا بُنا جاتا ہے۔ خیال کا تدریجی ارتقا بھی نظم کی ایک خصوصیت ہے۔ طویل نظموں میں یہ ارتقا واضح ہوتا ہے۔ جب کہ مختصر نظموں میں یہ ارتقا واضح نہیں ہوتا اور اکثر و بیشتر ایک تاثّر کی شکل میں اُبھرتا ہے۔

نظم کے لیے نہ تو ہیئت کی کوئی قید ہے اور نہ موضوعات کی۔ چنانچہ اردو میں غزل اور مثنوی کی ہیئت میں بھی نظمیں کہی گئی ہیں۔ نظم گو شعرا کے یہاں ترکیب بند اور ترجیع بند کی ہیئت بہت مقبول رہی ہے۔ ان دنوں نظم معرّا، آزاد نظم اور نثری نظم کی ہیئت کا چلن عام ہے۔

ہیئت کے اعتبار سے نظم کی چار قسمیں ہوسکتی ہیں:

1. پابند نظم

ایسی نظم جس میں بحر کے استعمال اور قافیوں کی ترکیب میں مقرّرہ اصولوں کی پابندی کی گئی ہو، پابند نظم کہلاتی ہے۔ نئے انداز کی ایسی نظمیں بھی، جن کے بندوں کی ساخت مروّجہ ہیئتوں سے مختلف ہو یا جن کے مصرعوں میں قافیوں کی ترتیب مروجہ اصولوں کے مطابق نہ ہو، لیکن ان کے تمام مصرعے برابر کے ہوں اور ان میں قافیے کا التزام پایا جائے، پابند نظمیں کہلاتی ہیں۔

© NCERT not to be republished

2. نظم معرّا

ایسی نظم جس کے تمام مصرعے برابر کے ہوں مگر ان میں قافیے کی پابندی نہ ہو، نظم معرّا کہلاتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے نظم عاری بھی کہا ہے۔ آج کل اسے نظم معرّا ہی کہا جاتا ہے۔

3. آزاد نظم

ایسی نظم جس میں نہ تو قافیے کی پابندی کی جاتی ہے اور نہ اس کے تمام مصرعے برابر ہوتے ہیں۔ یعنی جس کے مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں تاہم اس نظم میں بحر کی پابندی کی جاتی ہے۔

4. نثری نظم

نثری نظم چھوٹی بڑی نثری سطروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں نہ تو ردیف اور قافیے کی پابندی ہوتی ہے اور نہ ہی وزن کی۔ آج کل نثری نظم کا رواج دنیا کی تمام زبانوں میں عام ہے۔

© NCERT not to be republished

اکبرؔ الہ آبادی

(1846 – 1921)

سید اکبر حسین رضوی نام، اکبرؔ تخلص تھا۔ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن ضلع شاہ آباد میں گزرا۔ 1855 میں اپنے خاندان کے ساتھ الہ آباد گئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہاں پہلے ایک مکتب اور پھر جمنا مِشن اسکول میں داخل ہوئے لیکن 1857 کے انقلاب کے باعث تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ ملازمت کی ابتدا عرضی نویسی سے کی۔ کچھ مدت کے بعد الہ آباد ضلع میں نائب تحصیلدار ہوگئے۔ ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کرکے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ منصف کے عہدے پر بھی مامور ہوئے۔ 1898 میں انھیں حکومت سے خان بہادر کا خطاب ملا۔ اکبرؔ کی زندگی کا آخری زمانہ ذہنی وجسمانی تکالیف اور پریشانیوں میں گزرا۔ پچھتّر برس کی عمر میں الہ آباد ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اکبرؔ کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ انھوں نے عام رواج کے مطابق شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی۔ کلام پر اصلاح غلام حسین وحیدؔ سے لی جو آتشؔ کے شاگرد تھے۔ اکبرؔ کے کلام میں غزلوں کی تعداد کافی ہے اور ان میں اتنی جان ہے کہ انھیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ان کی انفرادیت ان کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں نظر آتی ہے۔ یہی شاعری ان کی دائمی شہرت کا باعث بنی اور اس میں کوئی دوسرا شاعر ان کا ہم سر نہ ہوسکا۔ اکبرؔ کی ظریفانہ شاعری محض ہنسنے ہنسانے کا ذریعہ نہیں۔ انھوں نے اس کے ذریعے انگریزی تعلیم کے منفی اثرات اور مغربی تہذیب کی اندھی تقلید پر بھرپور وار کیے اور چھوٹی چھوٹی نظموں سے وہ کام لیے جو بڑی بڑی تقریروں سے نہیں لیا جاسکتا تھا۔ اکبر الہ آبادی اگرچہ طنزیہ اور مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کی شاعری کا ایک بڑا حصّہ سنجیدہ شاعری پر مشتمل ہے۔ انھوں نے بہت سی نظموں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔

© NCERT not to be republished

جلوۂ دربارِ دہلی

سر میں شوق کا سودا دیکھا   دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا   کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا   اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا   حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

پلٹن اور رسالے دیکھے   گورے دیکھے کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے   بینڈ بجانے والے دیکھے

خیموں کا اِک جنگل دیکھا   اس جنگل میں منگل دیکھا
برھما اور ورنگل دیکھا   عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری   پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لَمپ سے جاری   تیزی تھی ہر جمپ سے جاری

ڈالی میں نارنگی دیکھی   محفل میں سارنگی دیکھی
بے رنگی بارنگی دیکھی   دہر کی رنگا رنگی دیکھی

© NCERT not to be republished

اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
منھ کو اگر چہ لٹکا دیکھا دل دربار سے اٹکا دیکھا

ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم ان کا چلنا کم کم تھم تھم
زرّیں جھولیں نور کا عالم میلوں تک وہ چم چم چم چم

پُر تھا پہلوئے مسجدِ جامع روشنیاں تھیں ہر سو لامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع سب کے سب تھے دید کے طامع

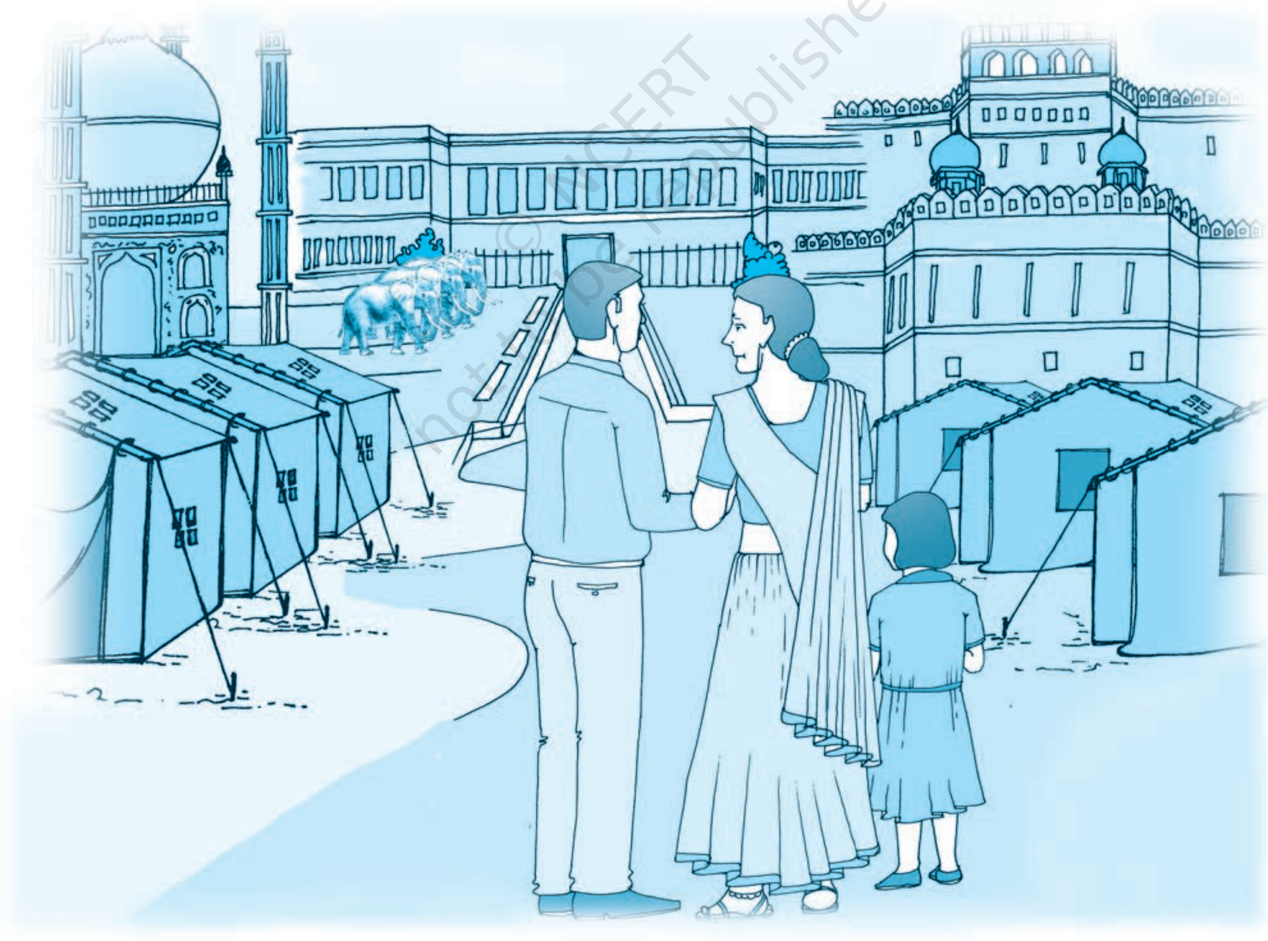

© NCERT not to be republished

سُرخی سڑک پہ کٹتی دیکھی سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی
آتش بازی چھٹتی دیکھی لُطف کی دولت لٹتی دیکھی

چوکی اِک چولکھّی دیکھی خوب ہی چکھی پکھی دیکھی
ہر سو نعمت رکھی دیکھی شہد اور دودھ کی مکھی دیکھی

ایک کا حصہ منّ و سلوا ایک کا حصہ تھوڑا حلوا
ایک کا حصہ بھیڑ اور بلوا میرا حصہ دور کا جلوا

اَوج برٹش راج کا دیکھا پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگِ زمانہ آج کا دیکھا رُخ کرزن مہراج کا دیکھا

پہنچے پھاند کے سات سمندر تحت میں ان کے بیسیوں بندر
حکمت و دانش ان کے اندر اپنی جگہ ہر ایک سکندر

اوجِ بخت ملاقی ان کا چرخِ ہفت طباقی اُن کا
محفل اُن کی ساقی اُن کا آنکھیں میری باقی اُن کا

ہم تو ان کے خیر طلب ہیں ہم کیا ،ایسے ہی سب کے سب ہیں
ان کے راج کے عمدہ ڈھب ہیں سب سامانِ عیش و طرب ہیں

____ اکبرالہ آبادی

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ ومعنی:

جلوہ	:	نمائش
سنگینیں	:	سنگین کی جمع، ایک نوک دار ہتھیار جو بندوق کی نال پر لگایا جاتا ہے
برھما	:	کائنات کو پیدا کرنے والا
عزت خواہ	:	عزت چاہنے والا
دہر	:	دنیا
لامع	:	چمکنے والا، روشن
سامع	:	سننے والا
طامع	:	لالچ کرنے والا، لالچی
چولکھّی	:	چارلاکھ کا، مراد قیمتی
منّ وسلوا	:	وہ کھانا جو حضرت موسیٰ کی امت پر آسمان سے اترا تھا، مراد بہت لذیذ کھانا
اوج	:	بلندی، اونچائی، شان، عروج
پرتو	:	عکس، پرچھائیں
ملاقی	:	ملنے والا، ملاقات کرنے والا
چرخ	:	آسمان، فلک، چکر، پہیا
ہفت طباقی	:	سات طبق والا، مراد سات آسمان
طرب	:	خوشی، مسرت، شادمانی

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

- دسمبر 1898 میں لارڈ کرزن نئے وائسرائے کی حیثیت سے ہندوستان آئے۔ انھوں نے 1903 میں دہلی میں دربار کیا۔ اسی دربار پر اکبرالہ آبادی نے یہ نظم لکھی ہے۔

- دوسرے بند میں لاٹ اور ڈیوک دو لفظ آئے ہیں ہندوستان میں لارڈ (Lord) کو عام لوگ لاٹ کہتے تھے۔ یہ برطانیہ کا اعزازی خطاب ہے۔ اس کے معنی مالک اور آقا کے بھی ہیں۔ گورنر یا حاکم صوبہ کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا تھا اسی طرح ڈیوک (Duke) بھی خطاب ہے نواب رئیس یا امیر کے لیے بھی یہ خطاب استعمال ہوتا تھا۔
- جنگل میں منگل ہونا محاورہ ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں ویرانے میں عیش و عشرت کا سامان ہونا یا غیر آباد جگہ میں رونق اور چہل پہل ہونا۔ دربار دہلی کے موقع پر کشمیری گیٹ سے باہر کنگزوے کیمپ تک خیمے لگائے گئے تھے۔ اس وقت یہ جگہ غیر آباد اور ویران تھی۔ خیمے لگنے کے بعد جب دربار کے لیے لوگ یہاں آئے تو خوب رونق اور چہل پہل ہوگئی۔ مصرعے میں اسی جانب اشارہ ہے۔
- اکبرالہ آبادی انگریزی الفاظ کا استعمال معنی خیز انداز میں کرتے ہیں۔ اس نظم میں بھی انھوں نے بہت سے انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ ''سر میں شوق کا سودا دیکھا'' سے کیا مراد ہے؟

2۔ ''خیموں کا اک جنگل دیکھا'' اس مصرعے میں شاعر نے کس منظر کی عکاسی کی ہے؟

3۔ ''میرا حصّہ دور کا جلوہ'' شاعر نے کیوں کہا ہے؟ وضاحت کیجیے۔

عملی کام:

- اس بند کے ردیف اور قافیے کی نشاندہی کیجیے۔

سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری	پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لمپ سے جاری	تیزی تھی ہر جمپ سے جاری

© NCERT not to be republished

محمد اقبالؔ

(1877 – 1938)

اقبالؔ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ شمس العلماء مولوی سید میر حسن سے فارسی، عربی اور دینی علوم کی تعلیم حاصل کی۔ سیالکوٹ ہی میں ایک انگریزی اسکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اسکاچ مِشن اسکول سے ایف۔ اے کیا۔ لاہور میں اعلیٰ تعلیم پائی۔ ابتدائی تعلیم کے زمانے ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔ اس وقت ہندوستان میں داغؔ کی شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ابتدا میں اقبالؔ نے خط وکتابت کے ذریعے ان سے اصلاح لی۔ لاہور ہی میں تعلیم کے دوران پروفیسر آرنلڈ سے فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ جب پروفیسر آرنلڈ انگلینڈ چلے گئے تو اُن کے اصرار پر اقبالؔ نے 1905 میں یورپ کا سفر کیا۔ وہاں فلسفے میں مزید مہارت پیدا کی اور فارسی ادب کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ اس کے بعد لندن واپس آکر بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ 1908 میں ہندوستان واپس آئے اور سر رشتۂ تعلیمات سے وابستہ ہوگئے۔ اس کے بعد بیرسٹری شروع کردی۔ اقبالؔ کی عالم گیر مقبولیت اور علمی مرتبے سے متاثر ہوکر حکومتِ برطانیہ نے انھیں ''سر'' کا خطاب عطا کیا۔ اس کے علاوہ بھی انھیں مختلف اعزازات پیش کیے گئے۔ علامہ اقبالؔ نے ایک طویل علالت کے بعد لاہور میں انتقال کیا۔

علامہ اقبالؔ کی نگارشات میں انگریزی، اُردو اور فارسی نثر ونظم کا کثیر سرمایہ شامل ہے۔ اُردو میں ان کے شعری مجموعے ''بانگِ درا''، ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' ہیں۔ ''ارمغانِ حجاز'' ان کے اُردو اور فارسی کلام کا مشترک مجموعہ ہے۔ فارسی میں اقبالؔ کے کئی مجموعے ہیں۔

اقبالؔ نے شاعری کو پیغام کا ذریعہ بنایا تھا۔ ان کی فکر میں حرکت وعمل کا فلسفہ کارفرما ہے۔ اقبالؔ کے افکار میں فلسفۂ خودی کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ اقبالؔ کی مذہبی فکر بھی ان کی شاعری کا اہم جُز ہے۔ مغرب کی ذہنی غلامی سے آزادی کے خیالات ان کے یہاں نمایاں ہیں۔

© NCERT not to be republished

حقیقتِ حسن

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جو نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا، یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی، اختر سحر نے سنی
سَحَر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتادی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہوگیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

—— محمد اقبالؔ

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی:

زوال	:	پستی، گراوٹ
تصویر خانہ	:	نگار خانہ، پکچر گیلری
شب دراز	:	لمبی رات
عدم	:	نہ ہونا
تغیر	:	تبدیلی
نمود	:	علامت، نشان، ظہور
اخترِ سحر	:	صبح کا ستارا
زمیں کے محرم	:	زمین کے رازدار
سوگوار	:	غمگین، افسردہ

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

- اقبالؔ کی یہ نظم دنیا کی بے ثباتی کی طرف اشارہ کرتی ہے اور تبدیلی کو کارخانۂ قدرت کا اصول سمجھتی ہے۔ کلی کا پھول بن جانا، موسمِ بہار کے بعد خزاں کا آنا اور شباب کے بعد بڑھاپے کی آمد، فطرت کے اسی اصول کے تحت واقع ہوتے ہیں۔
- اقبالؔ نے خدا اور حسن کے مکالمے کے ذریعے اس حقیقت کو آشکار کیا ہے کہ دنیا کی ہر شے فنا ہونے والی ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ فنا اس کا مقدر ہے بلکہ زوال ہی میں اس کا حسن پوشیدہ ہے۔
- دنیا کی ہر شے مثلاً چاند، تارے، شبنم، کلی اپنے تمام تر حسن کے باوجود فانی ہیں۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ حسن نے خدا سے کیا سوال کیا ہے؟

2۔ خدا اور حسن کے درمیان گفتگو کی خبر زمین کے باسیوں کو کس طرح ہوئی ؟

3۔ پھول، کلی، موسمِ بہار اور شباب کو شاعر نے سوگوار کیوں کہا ہے؟

4۔ نظم کے آخری شعر کی تشریح کیجیے۔

عملی کام:

- قمر کے معنی ہیں چاند— اردو میں چاند کے لیے اور بھی الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً ہلال ، بدر، ماہ، مہہ اور مہتاب۔ اسی طرح سورج کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ لکھیے۔

© NCERT not to be republished

جوشؔ ملیح آبادی

(1898 – 1982)

شبّیر حسن خاں نام، تخلص جوشؔ اور وطن ملیح آباد تھا۔ پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ علم وادب کی روایت خاندان میں بزرگوں سے چلی آرہی تھی۔ جوشؔ کی ابتدائی تعلیم وتربیت گھر پر ہوئی۔ عربی وفارسی میں اچھی استعداد پیدا کی۔ اس کے بعد لکھنؤ، سیتاپور، آگرہ اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔

1916 میں والد کے انتقال کے بعد وہ کلکتہ (کولکاتہ) چلے گئے یہاں اُن کی ملاقات رابندرناتھ ٹیگور سے ہوئی۔ ٹیگور کی شخصیت اور شاعری نے جوشؔ کو متاثر کیا۔ 1924 میں وہ عثمانیہ یونی ورسٹی، حیدرآباد کے دارالترجمہ میں ناظرِ ادب کے عہدے پر ملازم ہوگئے۔ 1934 میں دہلی آگئے جہاں ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ''قلم'' کے عنوان سے ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ اس کے بعد وہ پونا کی ایک فلم کمپنی میں ملازم ہوگئے۔ آزادی کے بعد حکومتِ ہند کے رسالے ''آج کل''، دہلی کے مدیر مقرر ہوئے۔ 1955 میں انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اسلام آباد (پاکستان) میں ان کا انتقال ہوا۔

جوشؔ ملیح آبادی انتہائی قادر الکلام شاعر تھے۔ اُن کا پہلا مجموعۂ کلام ''روحِ ادب'' 1929 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اُن کے کئی مجموعے منظرِ عام پر آئے جن میں ''شعلہ وشبنم''، ''حرف وحکایت'' اور ''سنبل وسلاسل'' قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کا آخری شعری کارنامہ نامکمل طویل نظم ''حرفِ آخر'' ہے۔ نثر میں اُن کی معروف کتاب اُن کی آپ بیتی ''یادوں کی برات'' ہے۔

جوشؔ نے غزلیں اور رباعیاں بھی کہی ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر ہیں۔ ابتدا میں اُن کی نظموں کا موضوع فطرت کی تصویر کشی تھا جس کی وجہ سے انھیں شاعرِ فطرت کہا جاتا تھا۔ تحریکِ آزادی کے زیرِ اثر اُنھوں نے حب وطن کے گیت گائے اور سیاسی مسائل کو موضوع بنایا۔ اپنے ولولہ انگیز لب ولہجے کی وجہ سے ''شاعرِ انقلاب'' کہلائے۔

© NCERT not to be republished

گرمی اور دیہاتی بازار

دوپہر، بازار دُکاں، گاؤں کی خَلقَت کا شور
خون کی پیاسی شعاعیں، روح فرسا لؤ کا زور
آگ کی رو، کاروبارِ زندگی کا پیچ و تاب
تند شعلے، سرخ ذرّے، گرم جھونکے، آفتاب
شور، ہلچل، غلغلہ ، ہیجان، لُو، گرمی، غُبار
بیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھناہٹ، گُڑ کی بو، مرچوں کی دھانس
خرپُزے، آلو، کھلی، گیہوں، کدو، تربوز، گھانس
دھوپ کی شدت، ہوا کی یورشیں، گرمی کی رَو
کملیوں پر سرخ چانول، ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جو
گرم ذرّوں کے شدائد، جھکّڑوں کی سختیاں
جھکڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کا دھواں
ماؤں کے کاندھے پہ بچے گردنیں ڈالے ہوئے
بھوک کی آنکھوں کے تارے، پیاس کے پالے ہوئے
بام و در لرزے ہوئے خورشید کے آفات سے
ہرنَفَس اک آنچ سی اُٹھتی ہوئی ذرّات سے

© NCERT not to be republished

5012CH20

مرد و زن گردش میں چیلوں کی صدا سنتے ہوئے
چلچلاتی دھوپ کی رو میں چنے بھنتے ہوئے
یوں شعاعیں سایۂ اشجار سے چھنتی ہوئی
میان سے موسم کی تیغِ بے اماں نکلی ہوئی
لوٗ کے مارے بام و در کی روح گھبرائی ہوئی
دوستوں کی شکل پر بیگانگی چھائی ہوئی
آسماں پر ابر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کا رم
نشے میں مُمسِک کا جیسے وعدۂ جود و کرم

© NCERT not to be republished

ہر روش پر چڑ چڑاپن، ہر صدا میں بے رخی
ہر جگر بھنتا ہوا، ہر کھوپڑی پکتی ہوئی
سر پہ کافر دھوپ جیسے روح پر عکس گناہ
تیز کرنیں، جیسے بوڑھے سود خواروں کی نگاہ

___ جوشؔ ملیح آبادی

مشق

لفظ ومعنی:

خلقت	:	مخلوق مراد عام لوگ
روح فرسا	:	روح کو تکلیف دینے والا
رَو	:	بہاؤ، دھار
پیچ وتاب	:	غصّے کی کیفیت
تند	:	تیز
غلغلہ	:	شور، ہنگامہ
ہیجان	:	پریشانی، بے چینی
خرپزے	:	خرپزہ کی جمع، مراد خربوزہ
شدائد	:	شدید کی جمع، سختیاں
آفات	:	آفت کی جمع، مصیبتیں
ہرنفس	:	ہر سانس

© NCERT not to be republished

گردش	:	چکّر
تیغ بے اماں	:	کھلی ہوئی تلوار جس کے وار سے بچنا مشکل ہو
بیگانگی	:	اجنبیت، بے تعلقی
سایۂ اشجار	:	درختوں کا سایہ
رَم	:	بھاگنا، دوڑنا
ممسک	:	کنجوس
وعدۂ جودوکرم	:	انعام واکرام کا وعدہ
روش	:	طور طریقہ
عکسِ گناہ	:	گناہ کی پرچھائیں
سودخوار	:	سود کھانے والا

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

- جوشؔ کی یہ نظم بیانیہ ہے اور منظر نگاری کا اچھا نمونہ ہے۔
- جوشؔ کو الفاظ کا جادوگر کہا جاتا ہے یہ نظم اس کی مثال ہے۔
- کسی خیالی یا مرئی چیز کو ٹھوس شکل میں پیش کرنا تمثیل کہلاتا ہے۔ اس نظم میں تمثیل کے کئی اچھے نمونے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''میان سے موسم کی تیغ بے اماں نکلی ہوئی''۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ شاعر نے دیہاتی بازار کی منظرکشی کس طرح کی ہے؟

2۔ دوستوں کی شکل پر بیگانگی کیوں نظر آرہی تھی؟

3۔ لُو کو روح فرسا کیوں کہا گیا ہے؟

4۔ 'کافر دھوپ' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

عملی کام:

- درج ذیل الفاظ سے واحد کی جمع اور جمع سے واحد بنایئے۔

قطار سختیاں گردنیں گرمی اشجار روح آفات

- اس نظم میں استعمال ہونے والے محاوروں، تشبیہوں اور تمثیلوں کی نشاندہی کیجیے۔

© NCERT not to be republished

اختر شیرانی

(1905 – 1948)

داؤد خاں نام، اخترؔ تخلص، مشہور محقق حافظ محمود خاں شیرانی کے بیٹے تھے۔ ٹونک میں پیدا ہوئے۔ تعلیم وتربیت لاہور میں ہوئی۔ یہاں ان کے والد اورینٹل کالج لاہور میں استاد تھے۔ اختر شیرانی نے لاہور کے کئی مشہور ادبی رسائل ''ہمایوں''، ''خیالستان''، ''شاہکار'' اور ''انتخاب'' میں ادارتی فرائض انجام دیے۔ جواں عمری میں انتقال ہوا۔

اختر ایک رومانی شاعر تھے انہوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی۔ اپنی رومانی نظموں کے باعث زیادہ مشہور ہوئے۔ اختر کی نظموں میں غنائیت پائی جاتی ہے۔ وہ لطیف جذبات مترنم انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں سرشاری اور سرمستی ہے۔ اختر کی رومانیت خواب وخیال سے زیادہ ہماری دھرتی اور اس کے حسن کے گرد گھومتی ہے اس لیے مانوس معلوم ہوتی ہے۔ اختر نے رومانی نظموں کے علاوہ سانیٹ بھی لکھے۔ ان کی نظموں کا دوسرا موضوع حب الوطنی ہے۔ ان کی نظمیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی محبت اور وطن کی خاطر کسی بھی قربانی کے لیے تیار ہیں۔

''پھولوں کے گیت''، ''شعرستان''، ''صبح بہار''، ''نغمۂ حرم''، ''طیورِ آوارہ''، ''اخترستان''، ''لالۂ طور''، ''شہ رو''، اور ''شبستان'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔

© NCERT not to be republished

اُو دیس سے آنے والے بتا!

(ایک نو وارد ہم وطن سے کسی غریب الوطن کا خطاب)

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا   کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سُنا!   کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن   وہ سروِ وطن، ریحانِ وطن

او دیس سے آنے والے بتا!

© NCERT not to be republished

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں   مستانہ ہوائیں آتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر   گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں   ویسے ہی دلوں کو بھاتی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا شام پڑے گلیوں میں وہی   دلچسپ اندھیرا ہوتا ہے؟
اور سڑکوں کی دُھندلی شمعوں پر   سایوں کا بسیرا ہوتا ہے
باغوں کی گھنیری شاخوں میں   جس طرح سویرا ہوتا ہے؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی مہکتے مندر سے — ناقوس کی آواز آتی ہے؟
کیا اب بھی مقدّس مسجد پر — مستانہ اذاں تھرّاتی ہے؟
اور شام کے رنگیں سایوں پر — عظمت کی جھلک چھا جاتی ہے؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا آم کے اُونچے پیڑوں پر — اب بھی وہ پپیہے بولتے ہیں؟
شاخوں کے حریری پردوں میں — نغموں کے خزانے کھولتے ہیں؟
ساون کے رسیلے گیتوں سے — تالاب میں امرس گھولتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

© NCERT not to be republished

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا پہلی سی ہے معصوم ابھی — وہ مدرسے کی شاداب فضا؟
کچھ بھُولے ہوئے دن گزرے ہیں — جس میں، وہ مثالِ خواب فضا؟
وہ کھیل، وہ ہم سِن، وہ میداں — وہ خواب گہِ مہتاب فضا؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی کسی کے سینے میں — باقی ہے ہماری چاہ بتا؟
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے اب — یاروں میں کوئی آہ بتا؟
او دیس سے آنے والے بتا — لِلّٰہ بتا، لِلّٰہ بتا؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا ہم کو وطن کے باغوں کی   مستانہ فضائیں بھُول گئیں؟
برکھا کی بہاریں بھول گئیں   ساون کی گھٹائیں بھُول گئیں؟
دریا کے کنارے بھُول گئے   جنگل کی ہوائیں بھُول گئیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا گاؤں پہ اب بھی ساون میں   برکھا کی بہاریں چھاتی ہیں؟
معصوم گھروں سے بھور بھئے   چکّی کی صدائیں آتی ہیں،
اور یاد میں اپنے میکے کی   بچھڑی ہوئی سکھیاں گاتی ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

© NCERT not to be republished

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی پرانے کھنڈروں پر تاریخ کی عبرت طاری ہے؟
اَن پورنا کے اُجڑے مندر پر مایوسی و حسرت طاری ہے؟
سنسان گھروں پر چھاؤنی کے ویرانی و رِقّت طاری ہے؟
او دیس سے آنے والے بتا!

___ اختر شیرانی

مشق

لفظ ومعنی:

نو وارد	:	نو کے معنی نیا، وارد آنے والا، نیا آیا ہوا مسافر
آوارۂ غربت	:	پردیس میں رہنے والا
کنعان	:	ملک شام کا ایک مقام جہاں حضرت یوسفؑ پیدا ہوئے تھے
فردوس	:	جنت
ریحان	:	ایک خوشبودار پھول
ناقوس	:	سنکھ جو پوجا کرتے وقت مندر میں بجایا جاتا ہے
حریری	:	ریشمی، ریشم کا باریک کپڑا
امرس	:	آم کا رس مراد مٹھاس
ہم سِن	:	ہم عمر، ہم جولی
خواب گہ	:	خواب گاہ، سونے کا کمرہ
ان پورنا	:	درگا دیوی، غذا کی دیوی

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

- اس نظم میں شاعر نے پردیس میں رہنے والے لوگوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے کہ کس طرح انھیں پردیس میں اپنے دیس کی ایک ایک چیز یاد آتی ہے۔
- نظم کے آخری بند میں عروج وزوال کی کہانی کو شاعر نے تین مصرعوں میں سمو دیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ قلعہ وحویلیاں بارونق ہوتی تھیں مگر جب ان کے مکیں نہیں رہے تو اُن کے مکان سونے ہو گئے اور وہ کھنڈر میں تبدیل ہو گئے۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ نظم کے پہلے بند میں ''آوارۂ غربت'' اور ''کنعانِ وطن'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

2۔ پردیس میں وطن سے آنے والے شخص سے شاعر بے تاب ہو کر کیا کیا پوچھتا ہے؟

3۔ ''او دیس سے آنے والے بتا للّٰہ بتا للّٰہ بتا'' سے شاعر کے کس احساس کا اظہار ہو رہا ہے؟

4۔ شاخوں کے حریری پردوں میں نغموں کے خزانے کون کھولتا ہے؟

عملی کام:

- نظم میں شامل تلمیحات اور استعارات کی نشاندہی کیجیے۔
- اپنے وطن کی خوبیوں پر ایک مضمون لکھیے۔

© NCERT not to be republished

کیفؔی اعظمی

(1917 – 2002)

نام اطہر حسین رضوی اور تخلص کیفؔی۔ اعظم گڑھ کے گاؤں رجواں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اس کے بعد لکھنؤ کے مشہور ادارے سلطان المدارس میں داخل ہوئے۔ کیفؔی اعظمی کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ طالب علمی کے زمانے سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ کیفؔی اعظمی کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے اس سلسلے میں کئی بار جیل گئے۔ 1943 میں بمبئی آگئے اور یہاں ایک رسالے ''قومی جنگ'' کی مجلس ادارت میں شامل ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی فلمی دنیا سے بھی ان کی وابستگی رہی اور کئی فلموں کے نغمے اور مکالمے لکھے۔ ان کی شاعری کے مجموعوں میں ''جھنکار'' (1945)، ''آخر شب'' (1947)، ''آوارہ سجدے'' (1973)، ''ابلیس کی مجلس شوریٰ (دوسرا اجلاس)'' (1977) اور ''سرمایہ'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے فلمی نغموں کا مجموعہ ''میری آواز سنو'' 1974 میں منظر عام پر آیا۔ ''آوارہ سجدے'' پر انھیں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

© NCERT not to be republished

آندھی

5012CH22

اُٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے
اُفق پر برق سی لہرا رہی ہے
قیامت ہر طرف منڈلارہی ہے
زمیں ہچکولے پیہم کھارہی ہے
اُٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے

© NCERT not to be republished

مچلتی ، جھومتی ، ہلچل مچاتی
تڑپتی، شور کرتی، دل ہلاتی
گرجتی، چیختی، فتنے اُٹھاتی
اُٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے
فضا میں آتشیں پرچم اُڑاتی
زمیں پر آگ کے دھارے گراتی
شرارے رولتی شعلے بچھاتی
سنہری روشنی پھیلا رہی ہے
اُٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے
بڑھی آتی ہے تعمیری تباہی
جھکی پڑتی ہے نور افزا سیاہی
جھکولے کھا رہا ہے قصرِ شاہی
بلا زنجیرِ در کھڑکا رہی ہے
اُٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے
نشاناتِ ستم تھرّا رہے ہیں
حکومت کے علم تھرّا رہے ہیں
غلامی کے قدم تھرّا رہے ہیں
غلامی اب وطن سے جارہی ہے
اُٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے

—— کیفی اعظمی

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ ومعنی:

قصرِ شاہی	:	شاہی محل
برق	:	بجلی
نشاناتِ ستم	:	ظلم کے نشانات
آتشیں پرچم	:	آگ جیسا جھنڈا مراد سرخ پرچم

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات:

- اس نظم کے ابتدائی دو بند'' آندھی'' کی شدّت اور زور کی منظر کشی کرتے ہیں۔تیسرے بند سے اس نظم کا مرکزی خیال ابھرتا ہے اور واضح ہوتا ہے کہ'' آندھی'' درحقیقت ظلم وستم کے خلاف عوامی جدوجہد اور آزادی کے لیے انقلابی ماحول کی عکاس ہے۔
- اس نظم میں مرکب الفاظ اور تراکیب کا خوبصورت استعمال ہے جیسے آتشیں پرچم، تعمیری تباہی، نور افزا سیاہی، نشاناتِ ستم۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ افق پر برق سی لہرانے سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

2۔ آندھی آنے کے کیا آثار نظر آتے ہیں؟

3۔ تعمیری تباہی سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

عملی کام:

- اس نظم کو زبانی یاد کیجیے۔
- درج ذیل لفظوں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

فتنے شرارے زنجیر علَم